ایدھی: ابو بن ادھم کا حقیقی کردار

تحریر: سہیل احمد لون

Leigh Hunt انیسویں صدی کے شاعر، نقاد اور مضمون نگار تھے۔ لی ہنٹ کی شاعری جب منظر عام پر آئی تو اس وقت John Keats اور Percy Shelley جیسے عظیم شعراء کی طوطی بولتی تھی۔ Shelly اور Keats کی موجودگی میں اپنی شاعری کا لوہا منوانا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کرکٹ میں وسیم اکرم اور وقار یونس کی موجودگی میں کسی عامیانہ باولر کا وکٹس لینا۔ Hunt ,Keats اور Shelly کی دوستی بھی بہت مشہور تھی اور ان تینوں کے لکھے ہوئے مضامین اور شاعری جدید انگریزی ادب میں آج بھی پڑھائی جاتی ہے۔ شاعری میں بعض اوقات تخیلاتی کردار بناتے ہیں اور اس پر مضمون، کہانی یا نظم لکھ دیتے ہیں۔ بعض اوقات ایک نظم یا ایک شعر بھی ٹریڈ مارک بن کر شاعر کو شہرت کی بلندیوں تک لے جاتا ہے۔ پاکستان میں انور مقصود صاحب کی ''ماں'' آج بھی فرمائش کر کے سنی جاتی ہے اور مشکوک تخلیق ''کاش میں تیرے ہاتھ کا کنگن ہوتا'' وصی شاہ جیسے عامیانہ شاعر کو مقبول کر گئی۔ تقریباً دو صدیاں قبل Leigh Hunt نے ایک نظم لکھی تھی جس کا عنوان "Abou Ben Adhem" تھا۔ یہ نظم ہمارے میٹرک کے نصاب میں بھی شامل تھی اور دسویں کے بورڈ کے امتحان میں اس نظم پر سمری لکھنے کا سوال بھی پیپر میں آیا تھا۔ تین دہائیاں قبل لگایا ہوا سمری کا رٹا آج تک دماغ میں اپنے نام کی طرح میرے ذہن میں موجود ہے۔ اس نظم میں Leigh Hunt نے ایک نہایت نیک انسان ابو بن ادھم کا ذکر کیا ہے جو اپنی خواب گاہ میں گہری نیند سے بیدار ہو کر یہ منظر دیکھتا ہے کہ اس کا کمرہ نور سے بھرا ہوا ہے اور ایک فرشتہ سنہری کتاب میں کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ ہمت کر کے فرشتے سے پوچھتا ہے کہ ''آپ کیا لکھ رہے ہیں؟'' فرشتہ جواب دیتا ہے کہ ''میں ان لوگوں کے نام لکھ رہا ہوں جو اللہ تعالی سے محبت کرتے ہیں''، ابو بن ادھم جھجکتے ہوئے اس سے پوچھتے ہیں کہ ''کیا اُس کا نام اس میں لکھا گیا ہے؟'' فرشتہ انکار میں سر ہلاتا ہے، ابو بن ادھم اسے کہتے ہیں کہ ''اس کا نام ان لوگوں میں لکھ دو جو اللہ پاک کی مخلوق سے پیار کرتے ہیں''۔ فرشتے نے اُن کا نام اُن لوگوں کی فہرست میں لکھا اور غائب ہو گیا۔ دوسری رات دوبارہ فرشتہ ابو بن ادھم کی خواب گاہ میں سنہری کتاب ہاتھ میں لیے نمودار ہوتا ہے۔ جس میں ان لوگوں کا نام لکھا ہوتا ہے جن سے اللہ تعالی محبت کرتے ہیں۔ فرشتہ جب کتاب ابو بن ادھم کو دکھاتا ہے تو اس میں سب سے پہلا نام ابو بن ادھم کا لکھا ہوتا ہے۔ یہ نظم پاکستان سمیت دیگر کئی ممالک میں نصاب کا حصہ بنی۔ بچپن میں جب رٹا لگایا تھا معصوم ذہن میں ابو بن ادھم کا ایک دھندلا سا خاکہ بنتا تھا مگر کبھی واضح خدوخال ذہن میں نہیں آئے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ پتہ چلا کہ یہ تو ہنٹ کا ایک خیالی کردار تھا جس کا حقیقی دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ مادیت پرستی کے دور میں صرف اللہ تعالی کو راضی کرنے کے لیے اس کی مخلوق سے بلا امتیاز اور بے لوث محبت تو شاید ماں کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ ماں کی محبت کا جذبہ بھی صرف اس کے اپنے بچوں تک محدود ہوتا ہے۔ مگر تمام بنی نوع انسان سے بغیر کسی لالچ اور طمع کے پیار کرنا ان کے دکھ درد میں مسیحا بننا ایک عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ نفسا نفسی کے دور میں ساٹھ منٹ کے لیے اپنے زندگی، جان و مال صرف انسانیت کے لیے وقف کرنے بھی مشکل ترین عمل دکھائی دیتا ہے مگر ایک شخص ساٹھ برس سے

اپنی جان و مال انسانیت کی بھلائی کے لیے وقف کر کے خود تو آنکھیں بند کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے مگر جاتے جاتے بھی اپنی آنکھیں عطیہ کر گئے کہ شاید یہ لوگ میری آنکھوں سے ہی دنیا کو دیکھتے رہیں۔

عبدالستار ایدھی دنیا سے چلے گئے مگر ان کا کام انکا نام ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ایدھی صاحب نے یہ ثابت کر دیا کہ سادگی، نیک نیتی، سچ، محنت اور صرف خدا تعالی پر بھروسہ رکھ کر کوئی بھی مشن شروع کیا جائے تو وہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔کرپشن کی دلدل میں پھنسے ہوئے دیس میں انہوں نے اپنا ادارہ ایمان داری سے چلا کر ملکی نظام چلانے والوں یہ دکھا دیا ہے کہ ''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیر ہے ساقی'' والی بات بالکل درست ہے۔گزشتہ ساٹھ برسوں میں تمام قومی ادارے زوال پزیر ہوئے اور معمولی کپڑے کی دکان سے اٹھ کر ایک ایمبولینس سے اپنے مشن کا آغاز کرنے والا ساٹھ برس میں وہ کچھ کر گیا جس کا تصور ریاستی ادارے آئندہ ساٹھ برسوں تک بھی نہیں کر سکتے۔محسن انسانیت جس نے اپنی زندگی ہی انسانوں کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی، ولی صفت بندہ جس نے خواب میں بھی پروٹوکول کا نہیں سوچا ہو گا۔ان کی بیماری کی شدت بڑھنے کے ساتھ فوٹو مافیا حرکت میں آ گیا اور میڈیا نے ان کی دلی مراد پوری کی۔ایدھی صاحب کی سانسیں پوری ہوتے ہیں انسان نما گدھ اپنے اپنے پروٹوکول کے ساتھ انکے نماز جنازہ میں شرکت کرنے آ گئے۔تعجب ہے کہ جن غریبوں کا خون چوسنے، ریاستی دہشت گردی کر کے خون بہانے میں جن کے ہاتھ رنگے ہوں وہ اگلی صفوں پر قبضہ جمائے ہوئے تھے، جبکہ لاکھوں لوگ جو ایدھی صاحب کے دنیا فانی سے کوچ کرنے کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر یتیم ہو گئے تھے ان کو آخری دیدار سے محروم رکھا گیا۔ایدھی صاحب نے اپنی قبر بھی پچیس برس قبل خود ہی تیار کر لی تھی اور یہ وصیت بھی فرما گئے تھی کہ ان کو انہیں کپڑوں میں دفن کیا جائے جو انہوں نے پہنے ہوں۔اگر ان کو پتہ ہوتا کہ ان کے جنازے کو اشرافیہ نے ہائی جیک کر کے پروٹوکول پروٹوکول کھیلنا ہے تو وہ جنازے کے لیے خصوصی وصیت بھی کر جاتے۔ریاستی اداروں اور حکومت کا کام عوام سے پیسے لیکر عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا ہوتا ہے جس کے لیے بڑی بڑی ڈگریوں اور بین الاقوامی شہرت یافتہ کمپنیوں میں کام کا تجربہ رکھنے والے افراد کا انتخاب کر کے نظام چلانے کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے مگر وہ بد دیانتی کا کام اتنی ایمانداری سے کرتے ہیں کہ غریب عوام کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوتا کہ ان کے ساتھ کیا گھناؤنا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔اگر عوام کا پیسہ عوام پر لگایا جائے تو سوئس بینکوں اور پاناما تک کچھ جانے کی نوبت نہ آتی۔ایدھی صاحب نے جو کر دکھایا وہ آج کی دنیا میں شاید کسی عام انسان کے لیے مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔انسان پیدا ہی مرنے کیلئے ہوتا ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ حقیقی انسان اپنے بعد سماج میں ایسا خلا پیدا کر دیتا ہے جو بد دیانت لوگوں سے تو عمر بھر پُر نہیں ہوتا لیکن دیانتدار معاشروں میں ایسے کرداروں کی نوبت ہی نہیں آتی کہ وہاں یہ ذمہ داری ریاست پوری کرتی ہے۔انسانی معاشرے میں لوگ مل جل کر رہتے ہیں بلکہ اب تو جیوگرافک چینل نے دنیا کو دکھا دیا ہے کہ جانوروں کا سماج اور اُن کے قانون بھی ہوتے ہیں جن پر عمل درآمد کیا جاتا ہے لیکن جو معاشرہ قانون کی پاسداری نہیں کرتا' جہاں لوگ انفرادی زندگی گزارتے ہیں وہاں عبدالستار ایدھی کو پیدا ہونا پڑتا ہے ورنہ لاشیں سڑکوں پر پڑی پڑی گل سڑ جائیں۔آج سے دو صدیاں قبل Leigh Hunt نے ابو بن ادھم کے عنوان سے جو نظم لکھی تھی اس کا حقیقی کردار ایدھی صاحب کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کہ وہ انسانوں سے پیار کرنے والے ایک عظیم انسان تھے اور یقیناً انکا نام بھی اس سنہری کتاب میں ضرور لکھا جائے گا

جن سے اللہ پاک اس لیے خصوصی محبت فرماتے ہیں کہ وہ اس کی مخلوق سے پیار کرتے ہیں۔میاں صاحبان نے اپنے ''فلاحی کارناموں'' کا ذکر نصاب میں بھی کروادیا ہے۔امید ہے انسانیت کا حقیقی درد رکھنے والے درویش صفت انسان جناب عبدالستار ایدھی پر مضامین بھی نصاب کا حصہ بنیں گئے تا کہ ہماری نسلوں کو ''حقیقی ابو بن ادھم'' کے نیک کاموں کا پتہ چلے ورنہ ایدھی تو ہمیشہ زندہ رہیں گئے لیکن بہت سے لوگ مرجائیں گے۔

تحریر: سہیل احمد لون

سربٹن۔سرے

11-07-2016

sohailloun@gmail.com